طاہر جاوید مغل

اکثر لوگوں کو اپنی ناآسودہ خواھشوں کی تکمیل کی صورت اولاد کی کامیابی وکامرانی میں نظر آتی ھے...... وہ چاھتے ھیں جو کچھ ان سے نہ ھوسکا ان کے بچے کر دکھائیں اور اس چاہ میں وہ بسااوقات بہت آگے تک بڑھ جاتے ھیں۔

منفرد موضوعات کی کہانی یا تراشنے والے طاہر جاوید مغل کا تازہ شاہکار

موسم ابر آلود تھا۔ دوپہر میں ہی شام کا سماں محسوس ہوتا تھا۔ وہ آرام دہ کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا دیوار گیر شیشے سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا پورا نام آصف عثمان تھا۔ عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا وہ جگہ ''پیزا اپیلس'' کہلاتی تھی۔ پیزا اپیلس کی پانچ چھ شاخیں لاہور شہر میں موجود تھیں۔ پیزا کھانے کے شوقین ''پیزا اپیلس'' کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ آصف عثمانی پیزا اپیلس کا مالک تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور سڑک کو دیکھتا رہا۔ یہاں بیٹھ کر سڑک کو دیکھنا اس کا پرانا مشغلہ تھا۔ بعض اوقات اس مشغلے کے سبب اسے دلچسپ مناظر دیکھنے کو ملتے تھے...... جیسے آج ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ منظر اس کے سامنے تھا۔ سڑک کے پار ایک انگلش میڈیم اسکول تھا۔ چھٹی ہوچکی تھی۔ بیشتر بچے گھروں کو روانہ ہوچکے تھے لیکن ایک عورت ابھی تک اپنے بچے کے انتظار میں پریشان تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے اسکول کے اندر بھی گئی تھی اور زیادہ پریشان ہوکر واپس آئی تھی۔ اب وہ موبائل پر کسی سے بات کررہی تھی۔ ایک خوش رنگ چھتری اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

موبائل پر بات کرنے کے بعد عورت ایک بار پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اسکول میں گئی۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی۔ وہ بدستور پریشان دکھائی دی۔ موبائل فون ایک بار پھر اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ فون بند کرکے کے بعد جواں سال عورت نے اسکول کے اردگرد کی دکانوں اور اسٹالز وغیرہ میں جھانکنا شروع کردیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا بچہ یہاں کہیں موجود ہوگا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا عورت کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اسی دوران بارش شروع ہوگئی۔ عورت نے چھتری کھولی اور پیزا پیلس کی سیڑھیوں پر شیڈ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ کئی اور راہگیر بھی اسی طرح دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔

بارش زور پکڑتی چلی گئی۔ آصف شیشے کے پار بڑی محویت سے اس پریشان حال عورت کو دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی شفقت کے ساتھ عورت کو اندر بلا لایا ''یہاں بیٹھو بیٹی! بارش تیز ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر یہ سلسلہ چلے گا۔''

''بہت شکریہ انکل۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''در..... دراصل..... میرا بیٹا.....''

آصف عثمانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرایا اور بولا ''تمہارے بتائے بغیر ہی میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر اس شیشے سے باہر سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پُرسوچ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہارا بیٹا نہیں مل رہا۔ اس لیے کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں..... وہ گھر بھی نہیں گیا ہے۔ اور میرے خیال میں..... وہ کسی ایسی جگہ پر نہیں جہاں تمہارے اندازے کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔''

''کک..... کیا مطلب انکل۔''

عثمانی نے نیا سگریٹ سلگا کر دو طویل کش لیے اور کسی ''فورکاسٹر'' کے سے پُرخیال انداز میں بولا ''کل اسکول میں PARENT'S MEETING ہے۔ سالانہ نتیجے کا اعلان بھی ہونا ہے۔ بچے کے ذہن پر نتیجے کا دباؤ تھا۔ بہت زیادہ دباؤ..... تمہاری تمام تر کوشش کے باوجود اس کی کارکردگی وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ تم نے اس سے بہت سی توقعات لگا رکھی تھیں۔ لیکن کل جو رزلٹ آنے والا تھا وہ تمہاری توقعات کے مطابق نہیں بلکہ شاید توقعات کے الٹ تھا..... اس لیے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ خاموشی سے کسی طرف نکل گیا ہے۔''

''یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔'' پریشان ماں کچھ اور پریشان ہوگئی۔ اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا۔

عثمانی نے بڑے دھیمے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ ''نہیں بٹی! بارش بہت تیز ہوگئی ہے۔ شاید اولے بھی پڑ رہے ہیں۔ ابھی تمہارا نکلنا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ پھر کہوگی تو میں بھی تمہارے ساتھ بچے کو ڈھونڈنے چلوں گا۔''

عورت نے نڈھال سے انداز میں شولڈر بیگ پھر میز پر رکھ دیا اور روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نومی بھاگ ..... میرا مطلب ہے..... گھر سے بھاگ گیا ہے۔''

عثمانی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا ''میں یہ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ..... یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوچکا ہے۔''

''کیا مطلب..... آپ کا بچہ بھی.....''

''نہیں میرا بچہ نہیں..... میں خود..... میں خود ایک بار بالکل ایسی ہی چویشن میں گھر سے بھاگا تھا..... ایسا ہی اسکول تھا، وقت بھی تقریباً یہی تھا۔ ماں بھی ایسی تھی بچہ بھی ایسا ہی تھا مگر یہ آج سے تقریباً 56 سال پہلے کی بات ہے۔''

عورت حیرت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے عثمانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر دن میں ہی رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔ بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔ عثمان نے شیشے کے پار خاموشی سے بھیگتے ہوئے اسکول کو دیکھا اور طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

''ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ بہن مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارے والد بچپن میں ہی فوت ہوگئے۔ ماں کپڑے سی کر اور کشیدہ کاری کرکے نہ صرف گھر چلارہی تھی بلکہ ہمیں پڑھا بھی رہی تھی۔ وہ مجھے بڑا افسر دیکھنا چاہتی تھی۔ میری پڑھائی کے لیے اس بے چاری نے اپنے آپ کو ہلکان کررکھا تھا۔ وہ خود پڑھی ہوئی نہیں تھی لیکن اس کے ذہن میں پڑھائی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس نے مجھ سے بڑی توقعات لگائی تھیں لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں توقعات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں نے اپنی مرضی سے سائنس سبجیکٹ رکھے تھے لیکن میتھ اور کیمسٹری ایسے مضامین تھے جو ہزار کوشش کے باوجود میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میں اپنی ناکامیوں پر اندر ہی اندر کڑھتا تھا مگر ماں کو بتاتا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے بہت سر مارا، بہت کوشش کی مگر اپنی ماں کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ اندر ہی اندر ایک طرح کی دیمک تھی جو مجھے کھاتی رہی۔ میری ماں جب کسی پڑوسن یا گھر آئے مہمان

ے میری تعریفیں کرتی اور بتاتی کہ میں کتنی محنت سے پڑھ رہا ہوں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے کس طرح خود کو ہلکان کر رہا ہوں تو میں شرم کے پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا۔ کوئی ایسا پڑھا لکھا عزیز یا جان پہچان والا تھا ہی نہیں جو اسکول جاتا اور میری شاندار کارکردگی کے بارے میں جانتا۔ بس میں ہی میں تھا اور میں اپنی سادہ لوح ماں کو سب اچھا کی رپورٹ دیتا رہا۔

میں جس دن گھر سے بھاگا، اس دن بھی میرے ماں نے صبح سویرے بڑے چاؤ سے مجھے انڈے پراٹھے کا ناشتا کرایا تھا۔ پانی میں بھیگے ہوئے بادام چھیل کر کھلائے تھے۔ مجھ پر سورۃ پڑھ کر پھونکی تھی اور جب میں باہر کے دروازے سے نکلا تھا تو پکار کر کہا تھا'' دعا پڑھ لینا آصفی ''۔

یہاں تک کہہ کر آصف عثمانی نے چند لمحے کی خاموشی اختیار کی۔ اس کی آنکھیں جیسے نصف صدی پرانے ان مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر ہلکی ہلکی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔'' میں ان دنوں نویں میں پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا جسم ہونے کے باعث اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ میرے کلاس ٹیچر پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکے تھے کہ میں اپنی والدہ یا کسی دوسرے بڑے کو اپنے ساتھ اسکول لاؤں۔ میں ہر مرتبہ مختلف بہانوں سے ٹالتا رہا تھا۔ لیکن اس دن کوئی بہانہ کام نہیں آیا۔ اگلے روز رزلٹ تھا۔ اسکول ٹیچر نے صاف کہہ دیا تھا کہ کل تمہارا کوئی بڑا تمہارے ساتھ ہوگا یا پھر میں خود تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گا۔ ہاں وہ بھی ایک اداس سہ پہر تھی۔ اسکول سے باہر آنے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا گھر میں میری ماں سالن پکا چکی ہوگی اور اس انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ میرے گھر میں پہنچتے ہی تازہ روٹی اتار کر میرے سامنے رکھے۔ کوئی کشش مجھے ماں کی اور تازہ روٹی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن ایک خوف مجھے ماں سے دور بھی کر رہا تھا اور یہ بڑا زور آور خوف تھا اتنا زور آور کہ ماں کی کشش بھی بے اثر ہو رہی تھی۔ یہ خوف تھا ماں کی آرزوؤں اور خوش فہمیوں کا شیشہ ٹوٹنے کا...... میں ماں کے چہرے کی وہ حیرت اور تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا جو اسے میری حقیقت جاننے کے بعد جھیلنا تھی...... اور پھر اس سہ پہر میں گھر نہیں گیا۔ میں شہر کے ایک دوسرے گوشے میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام تک سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ شام کے سائے تاریکی میں بدل گئے تو ایک شخص میرے پاس آبیٹھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا' چہرے پر عینک تھی۔ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھنا چاہا کہ میں اسکول سے چھٹی کے بعد گھر کیوں نہیں گیا اور یہاں آوارہ گردی کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے اسے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں بتائی۔ اس کے بہت پوچھنے کے باوجود میں نے اسے اپنے گھر یا کسی جان پہچان والے کا پتا بھی نہیں بتایا۔ وہ بہت سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ اسے یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ کہیں میں اسی طرح آوارہ گردی کرتا کسی غلط سلط بندے کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اس نے بالآخر مجھ سے پوچھا۔'' کیا میرے ساتھ میرے گھر جانا پسند کرو گے؟''

'' آپ کا گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

'' دور ہے لیکن اتنا دور بھی نہیں۔ اگر تم چاہو تو کل صبح ہم پھر شہر آجائیں گے۔''

میں نے رضامندی ظاہر کی اور وہ مجھے بس پر اپنے ساتھ سوار کرا کے لاہور کے ایک مضافاتی قصبے میں لے آیا۔ یہ ایک نیم پختہ مکان تھا۔ چاروں طرف کھیت اور درخت تھے۔ بارڈر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے شخص کا نام حیات محمد تھا۔ اتفاقاً وہ بھی ایک اسکول ٹیچر تھا اور قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس نیم پختہ گھر میں وہ اپنی والدہ، اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ

رہتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا انور میرا ہی ہم عمر تھا۔

دو تین دن میں میں ان لوگوں سے گھل مل گیا۔ حیات محمد مجھے جلد از جلد میرے گھر واپس پہنچانا چاہتا تھا مگر خوف اور شرمندگی کے سبب میں کچھ بتا کر ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ زیادہ زور ڈالتے تھے تو میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ میرے اندر کا ڈر بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے ماموں کا خیال آتا تھا جو ایسے معاملوں میں بے حد سخت تھے اور ماں کا خیال آتا تھا جس کا سامنا کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ اسے لڑکپن کی نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ جس ماں کو میں اپنے فیل ہونے کا دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اس کو اپنے لاپتا ہونے کا سنگین ترین غم دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ شاید ایک دو روز میں میں حیات محمد کے سمجھانے بجھانے کے سبب ''واپسی'' کے بارے میں سوچنے لگتا لیکن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

میرے ہم عمر انور کو چڑیوں کے شکار کا شوق تھا۔ دیہاتی علاقوں کی یہ چڑیاں عام چڑیوں سے کچھ بڑی ہوتی ہیں۔ انہیں شوق سے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ انور کے پاس ایئر گن تھی۔ وہ مجھے اپنی سائیکل کے عقب میں بٹھا کر شکار کے لیے نکل گیا۔ اس سے پہلے بھی ہم دو بار جنگل جا چکے تھے...... اور کپڑے کے تھیلے میں کافی سارا شکار لے کر آئے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آج ہم خود شکار ہونے جا رہے ہیں۔ اس روز ہم درختوں میں ایئر گن چلاتے چلاتے کافی آگے نکل گئے۔ پھر ایک زخمی فاختہ کا پیچھا کرتے ہمیں پتا ہی نہیں چلا ہم نے کب وہ ان دیکھی لائن عبور کر لی جسے بارڈر کہا جاتا ہے۔ تین چار باوردی افراد نے ہمیں للکارا پھر ہمیں پکڑنے کے لیے بھاگے۔ انور تو کسی نہ کسی طرح واپس بھاگنے میں کامیاب ہو گیا مگر میں پکڑا گیا۔ مجھے کئی دن بعد پتا چل سکا کہ میں انڈیا میں ہوں۔ دراصل مجھے انڈیا کی بارڈر سیکیورٹی فورس نے اپنی حدود کے اندر سے پکڑا تھا۔''

آصف عثمانی نے توقف کر کے نیا سگریٹ سلگایا۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تنی ہوئی ہے۔ عورت کے موبائل فون کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے آصف عثمانی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے کے بعد پی ٹی سی ایل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر شاید تیز بارش کے سبب وہ بھی ڈیڈ ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر بے دم سی ہو کر بیٹھی اور آصف عثمانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اپنی روداد کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو گی بیٹی!'' اس سنسناتی دوپہر میں چڑیاں پکڑتے پکڑتے انڈین فورس کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد میں پورے دس سال تک ...... ہاں پورے دس سال تک واپس اپنی زمین پر قدم نہیں رکھ سکا۔ یہ دس سال میں نے کہاں کہاں اور کس کس طرح گزارے یہ ایک بہت طویل کہانی ہے۔ نہ کوئی عدالت تھی، نہ مقدمہ نہ کوئی چارج شیٹ...... بس ایک قیدی تھا اور اس کے اردگرد کھڑی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ میں ان دیواروں کے پیچھے تڑپ تڑپ کر میں اپنے گھر کو یاد کرتا تھا، اپنے گلی کوچوں کو اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کو۔ ماں کی انتظار اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہر وقت میرے تصور میں رہتی تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میں بھی بلک بلک کر روتا تھا۔ میرے آنسو خشک ہو جاتے، میرا گلا بیٹھ جاتا تھا مگر کوئی میری فریاد نہیں سنتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس پنجرے کا عادی ہونے لگا جس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ شامیں اور صبحیں گزرتی رہیں، دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ مجھے مشرقی پنجاب کی دو تین جیلوں میں رکھا گیا۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی جیل میں بھی بھیجا گیا۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھ گچھ بھی کی جاتی تھی مگر میرے پاس ایک ایئر گن، ایک سائیکل اور ایک زخمی فاختہ کے سوا بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

دس سال بعد جس طرح میں اچانک پکڑا گیا تھا، اسی طرح اچانک رہا بھی ہو گیا۔ اب میں قریباً 25 سال کا ایک بھرپور جوان تھا۔ کچھ خوش پوش افراد آئے۔ انہوں نے مجھ سے چند کاغذات پر دستخط لیے اور مجھے ایک گاڑی میں سوار کرا کے بعد بارڈر پر لے آئے۔ یہاں مجھے پاکستانی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔

میں اپنی ماں اور اپنے گلی کوچوں کے لیے ایسے ہی تڑپ رہا تھا جیسے تپتے ریگستان میں کئی دن کا پیاسا پانی سے بھرے گلاس کے لیے تڑپتا ہے۔ مجھے یاد ہے لاہور پہنچتے ہی میں سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے دس سال بعد مجھے آج چھٹی ملی ہے۔ میں کمر پر اسکول بیگ اٹھائے اپنی ماں کی طرف بھاگا جا رہا ہوں اور وہ میرے لیے تازہ روٹی اتارنے کے لیے چولہے کے سامنے تیار بیٹھی ہے۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا...... تو سارا نقشہ ہی تبدیل نظر آیا۔ کرائے کا وہ گھر مسمار ہو چکا تھا جہاں ہم ...... رہا کرتے تھے...... وہاں اب دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ مالک مکان فوت ہو چکا تھا۔ میں اس کے بھائی سے ملا۔ اسے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری ماں میرے غم میں بیمار ہو گئی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح مجھے سڑکوں پر تلاش کرتی رہتی تھی۔ پھر اس کا بھائی اسے اور

میرے چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ یہ کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات تھی۔

میں سیالکوٹ کے اس دور دراز گاؤں میں اپنے ماموں کے پاس پہنچا۔ وہ پہلے سے کہیں بوڑھے نظر آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اور بمشکل پہچان کر انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ ان کی زبانی مجھ پر یہ بجلی گری کہ میری ماں تقریباً پانچ سال پہلے غموں کی اس دنیا سے چھٹکارا پا گئی تھی۔ وہ قریباً پانچ برس تک دن رات میری راہ دیکھتی رہی۔ وہ گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں کرنے دیتی تھی۔ ہر دستک پر اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی تھی۔ جب وہ لاہور میں بیمار ہوئی تو میرے ماموں اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آئے۔ انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا۔ لیکن اس کو چین نہیں تھا۔ وہ نیم دیوانی سی ہوگئی تھی۔ ہر ایک دو ماہ بعد چپکے سے لاہور چلی جاتی تھی۔ اس کے پرس میں میری دو تین تصویریں رہتی تھیں۔ لوگوں کو میری تصویریں دکھاتی، گلی کوچوں میں مجھے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ تپتی گرم دوپہروں میں گھنٹوں میرے اسکول کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔ کئی برس گزرنے کے باوجود اسے وہم رہتا تھا کہ میں اس اسکول کے آس پاس سے کہیں ملوں گا۔ یہاں لاہور میں ایک کتب فروش حاجی عنایت نے اسے اپنی بہن بنا رکھا تھا۔ وہ حاجی عنایت کے گھر کی بیٹھک میں قیام کرتی تھی۔ میرے ماموں اسے یہیں سے واپس گاؤں لے کر جایا کرتے تھے۔ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات کو وہ حاجی عنایت کے گھر واپس نہیں آئی، حاجی عنایت اور ان کے گھر والے رات بھر اسے ڈھونڈتے رہے۔ اگلے روز اس دکھیاری کی لاش میو اسپتال کے سرد خانے سے ملی۔ وہ سڑک کے کنارے چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گری تھی۔ اس کے بائیں پہلو پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے وہ ختم ہوگئی۔ بتانے والوں نے بتایا کہ مرتے وقت اس کے ہونٹوں پر میرا ہی نام تھا۔''

آصف وارثی کی آنکھیں تر ہوگئیں۔ اس نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر آنسو پونچھے اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر خلا میں گھور کر جیسے اس نے گزرے دنوں کو یاد کیا اور بولا ''اپنے ماموں سے اپنی ماں کے مرنے کی روداد سن کر میرا دل میرے سینے کے اندر پھٹ سا گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنی بے کار زندگی ختم کر کے اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ جس صورت کو دیکھنے کے لیے دس برس تک دن رات آنسو بہائے تھے، وہ منوں مٹی کے نیچے چھپ چکی تھی۔

کئی دنوں یا شاید کئی ہفتوں تک میں ہوش وحواس سے بیگانہ رہا۔ گاؤں کے قبرستان میں جا کر ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھا رہتا اور اپنی غلطی کی معافی مانگتا رہتا۔ ایک ناقابلِ بیان پچھتاوا مجھے اندر سے مسمار کر رہا تھا۔ کاش دس سال پہلے کا وہ لمحہ لوٹ آتا جب میرے قدم گھر کی طرف اٹھتے اٹھتے مخالف سمت میں اٹھ گئے تھے۔

زندگی جیسے تیسے جینے کا رستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ کچھ عرصے بعد ماموں ممانی اور چھوٹی بہن کی کوششوں سے میں بھی زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ دو سال پہلے ماموں نے ہی میری چھوٹی بہن کی شادی کردی تھی اور اب وہ اپنے گھر میں خوش تھی...... ان دنوں میرے دل میں یہ شدید ترین خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی مرحوم ماں کی خواہش پوری کروں۔ میں تعلیم حاصل کروں اور کچھ بن کر دکھاؤں۔ قریباً چھبیس برس کی عمر میں میں نے ایک بار پھر میٹرک میں داخلہ لے لیا۔ ماں کے چھوڑے ہوئے چند زیورات سے سہارا مل گیا۔ میں نے سخت محنت کی...... دن رات ایک کر دیا...... لیکن تب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آج بھی سخت محنت اور کوشش کے باوجود میری ''پروگریس'' تسلی بخش نہیں تھی...... مگر اب ایک بات تھی۔ اب میں بچہ نہیں تھا۔ اب میں اپنی خامیوں اور خوبیوں پر غور کرسکتا تھا اور میں نے خوب غور کیا۔ مجھے پتا چلا کہ میرا مسئلہ آج بھی میرے غیر موزوں مضامین ہیں۔ خاص طور سے کیمسٹری اور میتھ وغیرہ میں میری دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ میں نے اپنے اساتذہ سے اس بارے میں تفصیل سے مشورہ کیا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے سائنس کے بجائے آرٹس رکھنی چاہیے۔ آخر آرٹس بھی تو علم کی ایک معروف شاخ تھی۔ میں نے آرٹس کے مضامین رکھے۔ خوب جم کر محنت کی اور میٹرک بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ایف اے اور پھر بی اے...... میں نے یہ امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ میرے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میں آرٹس کے مضامین میں ہی کچھ کر کے دکھاؤں گا اور دوسروں کے لیے مثال قائم کروں گا۔ ایم اے میں میں نے انگلش رکھی اور پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد ایم اے معاشیات کیا۔ یہیں سے میری دلچسپی ''ہوٹل مینجمنٹ'' کی طرف ہوگئی۔ اس شعبے میں میں نے اوپر تلے دو اہم ڈپلومے حاصل کیے اور پھر ایک ڈپلوما کے لیے انگلینڈ بھی گیا۔ اس کے بعد میں ہوٹلنگ کے کاروبار کی طرف آگیا۔ میں نے جدید طرز کا ایک پیزا ریسٹورنٹ بنایا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا...... اب پیزا پیلس کا نام کئی شہروں میں بڑی اچھی طرح

جانا پہچانا جاتا ہے...... کئی شہروں میں اس کی شاخیں کھل چکی ہیں۔ میں ہر طرح ایک کامیاب شخص ہوں...... ہاں بیٹی! میں سائنس پڑھے بغیر بھی ایک کامیاب شخص ہوں۔ مشہور و معروف ڈاکٹر اور انجینئر ایک ماہ میں اتنا نہیں کماتے ہوں گے جتنا میں ایک دن میں کما لیتا ہوں۔ میں نے شادی کی ہے، میرے بچے ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔ لیکن ایک بچہ آج بھی میرے اندر چھپا ہوا ہے...... یہ بچہ آج بھی اس اسکول کے اردگرد رہنا چاہتا ہے۔ جیسے اسے امید ہو کر اس کی ماں آج نہیں تو کل اسے لینے کے لیے یہاں آئے گی۔ میں اس کرسی پر اس شیشے کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ پھر بھی یہاں بیٹھنا اور چھٹی کے وقت اسکول کے گیٹ کی طرف دیکھتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

آصف عثمانی کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں پھر نم ہوگئیں۔

کھڑکیوں کے باہر بھی بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ایک بار اتنے زور سے بجلی کڑکی کہ یہی لگا، کہیں آس پاس گر گئی ہے۔ پریشان ماں پوری جان سے لرز گئی۔ وہ کراہی ''ہائے میں کیا کروں؟ وہ کہاں ہوگا؟ وہ تو بجلی سے ڈرتا ہے...... ہائے اللہ میں کدھر جاؤں۔ دو دن سے بخار ہے اسے...... صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا۔'' وہ سسکنے لگی۔

آصف کھوئی کھوئی آبدیدہ آواز میں بولا۔ ''جن کے جانے سے اتنا تڑپنا پڑے انہیں جانے ہی نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ جب قدم اٹھ جاتے ہیں...... تو پھر بہت دور بھی نکل جایا کرتے ہیں۔

آج کل...... کے حالات آج سے پچاس سال پہلے کے حالات سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ آج تو یہ شہر انسانوں سے بھرے ہوئے خطرناک جنگل بن گئے ہیں۔''

عورت کا رنگ زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بڑبڑانے لگی تھی۔ غالباً دعائیں پڑھ رہی تھی۔ سامنے ہی پیزا پیلس کے ڈائننگ ہال میں ٹی وی چل رہا تھا۔ نیوز چینل سے مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ طوفان باد و باراں کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی تھی۔ اچانک ایک خبر نے عورت کے ساتھ ساتھ آصف کو بھی پوری طرح متوجہ کر لیا۔ یہ تازہ ترین خبر دل دہلا دینے والی تھی۔ ایک قریبی شاہراہ پر ہوا کے زور سے ایک بہت بڑا ہورڈنگ (اشتہاری بورڈ) زمین بوس ہو گیا تھا۔ اس کے نیچے آ کر دو افراد ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں اسکول کا ایک بچہ بھی تھا۔ نیوز چینل کا کیمرا تازہ ترین مناظر دکھا رہا تھا۔ چند افراد ہلاک ہونے والے لہولہان بچے کو افراتفری کے عالم میں ایمبولینس کے اندر ڈال رہے تھے۔ بچے کی ایک جھلک نظر آئی تو عورت کربناک انداز میں چلا اٹھی۔ اس کی لرزہ خیز آواز پورے پیزا پیلس میں گونجتی اور لپکتی چلی گئی۔ ''میرا بچہ...... ہائے میرا بچہ......'' اس نے دہائی دی اور اٹھ کر دیوانہ وار باہر بھاگی۔ باہر بارش کی طوفانی بوچھاڑیں اور چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں تھیں لیکن اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ''ہائے میرا لومی'' وہ روتی کرلاتی سڑک پر پہنچی۔ آصف عثمانی اس کے پیچھے بھاگا اس سے پہلے کہ وہ عالم دیوانگی میں کسی گاڑی سے ٹکرا جاتی، آصف عثمانی نے اسے تھام لیا...... اور کھینچتا ہوا واپس اپنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''ہوش کرو بیٹی، یہ تمہارا بچہ نہیں ہے...... یہ نہیں ہے تمہارا بچہ......''

وہ حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ''تمہارا بچہ میرے پاس ہے...... آؤ میں تمہیں ملاؤں اس سے۔''

چند سیکنڈ بعد ایک اندرونی کمرے...... سے عورت کا تیرہ چودہ سالہ بیٹا اپنے اسکول بیگ سمیت برآمد ہوا اور ماں سے لپٹ گیا۔ ماں اور بچے کا ملاپ دیدنی تھا۔ ماں بچے کو دیوانہ وار چومتی اور لپٹاتی چلی جا رہی تھی۔ آصف عثمانی ایک کونے میں کھڑا دل گداز نظروں سے اس ملاپ کو دیکھتا رہا۔

دو چار منٹ بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا دریا اترا تو آصف عثمانی نے عورت کو بتایا کہ کس طرح اس نے ''پیزا پیلس'' کے اندر سے بچے کی حرکات و سکنات دیکھیں اور اسے اندازہ ہوا کہ بچہ گھر سے بھاگنے والا ہے۔ وہ اسے سمجھا بجھا کر اندر لے آیا، اسے کمرے میں بٹھایا اور کھانا وغیرہ کھلایا۔

عورت بس سر جھکا کر ہچکیوں کے ساتھ روتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن یہ خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔ آصف عثمانی نے اس کے کندھے پر اپنا بوڑھا ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔ ''بیٹی! میری ماں تو بے چاری ان پڑھ تھی، اپنے بچے کی الجھنوں کو نہ جان سکی لیکن تم تو ان پڑھ نہیں ہو۔ دیکھو! میں تمہارے سامنے...... اور تمہاری جیسی ساری ماؤں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اپنے معصوم بچوں سے بے خبر نہ رہو...... ان سے اچھی امیدیں ضرور لگاؤ لیکن ان امیدوں کا سارا بوجھ، تنہا ان پر ہی نہ ڈال دو...... نہیں تو...... نہیں تو......'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رخ پھیر کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ آج پھر اس کو اکیلے کمرے میں بیٹھ کر دیر تک رونا تھا۔